چڑھتے سورجوں کے دوست

جاوید چودھری

وہ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوا۔ چھے سال کی عمر میں ولی عہد بنا اور ۲۲ سال کی عمر میں ایران کا بادشاہ بن گیا۔ وہ محمد رضا شاہ پہلوی تھا لیکن پوری دنیا اسے شاہ ایران کے نام سے جانتی تھی۔ وہ ایشیا میں امریکہ کا سب سے بڑا دوست تھا۔ یورپی پریس اسے ''امریکن گورنر'' کہتا تھا۔ وہ امریکی وفاداری میں بہت آگے چلا گیا۔ امریکہ نے اسے روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا حکم دیا اور اس نے ایران میں داڑھی اور پردہ پر پابندی لگا دی۔ اس کے دور میں کوئی باپردہ عورت گھر سے نکلتی تھی تو پولیس سرِ عام اس کا برقع پھاڑ دیتی تھی۔ شاہ ایران نے تمام زنانہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سکرٹ کو یونیفارم بنا دیا۔ شراب نوشی، رقص اور زنا فیشن بن گیا۔ شاہ کے دور میں ایران دنیا کا واحد ملک تھا جس میں کالجوں میں شراب کی دکانیں تھیں۔ یونیورسٹیوں میں خواتین کی سودے بازی ہوتی تھی اور اس مکروہ کاروبار کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ شاہ کے زمانے میں دو جرنیلوں کے ہم جنس پرست بیٹوں نے آپس میں شادی کی۔ سرکاری سطح پر نہ صرف ان کی دعوت ولیمہ ہوئی بلکہ شاہ اور اس کی کابینہ نے خصوصی طور پر اس تقریب میں شرکت کی۔ شاہ نے امریکہ کی محبت میں ایران میں موجود ۴۲ ہزار امریکیوں کو سفارتی حیثیت دے دی۔ امریکہ نے شاہ ایران کے دفتر میں ''گرین فون'' لگا رکھا تھا اور اسے امریکہ سے جو ہدایات ملتی تھیں، وہ ان پر فوری عملدرآمد کراتا تھا لیکن پھر شاہ کی امریکہ نواز پالیسیوں پر بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت تین سال تک چلتی رہی۔ شاہ نے ۱۲ شہروں میں مارشل لاء لگا دیا، عوام نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ شاہ نے حکومت، شاہ پور بختیار کے حوالے کی اور ملک سے فرار ہو گیا۔ اس کا خیال تھا امریکہ اب اس کی وفاداریوں کا بدلہ دے گا لیکن جوں ہی شاہ ایران کا طیارہ ایران کی حدود سے نکلا، امریکہ نے آنکھیں پھیر لیں، شاہ پہلے مصر گیا، پھر مراکش، پھر بہاماس اور پھر میکسیکو۔ وہ اس دوران امریکہ سے مسلسل مدد مانگتا رہا لیکن وائٹ ہاؤس اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتا تھا۔ شاہ ایران سوا سال تک مارا مارا پھرتا رہا لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی۔ امریکہ نے اس کے اکاؤنٹس تک ''سیز'' کر دیئے۔ آخر میں انور السادات کام آیا اور اس نے اسے پناہ دے دی۔ جولائی ۱۹۸۰ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت اس کے پاس اس کی تیسری بیوی کے سوا کوئی نہ تھا۔ لوگ اس کا جنازہ تک پڑھنے نہ آئے۔ چنانچہ اسے اس کے بیڈ روم ہی میں امانتاً دفن کر دیا گیا۔

یہ صرف رضا شاہ پہلوی کی کہانی نہیں، امریکہ کا ہر دوست حکمران اسی انجام کا شکار رہا۔ آپ ''اناس تاسیوسو'' کی

مثال لیجیے۔ وہ نکاراگوا میں امریکی ایجنٹ تھا۔ نکاراگوا میں کمیونزم کی تحریک شروع ہوئی تو امریکہ نے اناس تاسیوسو کو ڈالر اور اسلحہ دے کر کمیونزم کے خلاف کھڑا کر دیا۔ تاسیوسو امریکہ کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر لڑتا رہا۔ ۱۹۷۹ء میں نکاراگوا میں اس کے لیے حالات مشکل ہو گئے۔ وہ ملک سے فرار ہوا لیکن جوں ہی اس نے نکاراگوا سے باہر قدم رکھا۔ امریکہ نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس نے امریکہ آنے کی کوشش کی لیکن امریکی حکومت نے اجازت نہ دی۔ یوں اناس تاسیوسو جنگلوں اور غاروں میں چھپ کر زندگی گزارنے لگا۔ وہ ۱۹۸۰ء میں اسی پریشانی کے عالم میں انتقال کر گیا اور اس کے چند قریبی دوستوں نے اسے پیراگوئے کے شہر اسنشن میں دفن کر دیا۔ آج لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔

چلی کے آمر ’’جنرل اگارتے اگستو پنوشے‘‘ نے ۱۹۷۳ء میں سی آئی اے کی مدد سے جنرل ایلینڈو کی منتخب حکومت پر شب خون مارا تھا۔ پنوشے نے اقتدار میں آتے ہی چلی کی عوام کے خلاف آپریشن شروع کر دیا۔ پنوشے ۱۹۹۰ء تک چلی پر حکمران رہا۔ ان ۱۷ برسوں میں پنوشے نے امریکہ کے کہنے پر ہزاروں شہری قتل کرائے، امریکہ کی ناپسندیدہ تنظیموں پر پابندیاں لگائیں اور امریکہ کی خواہش پر اپنے شہریوں کے انسانی حقوق غصب کیے۔ عوام ۱۹۹۰ء میں پنوشے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ مارچ ۱۹۹۰ء میں لندن فرار ہو گیا۔ اس کا خیال تھا برطانیہ اور امریکہ اس کی وفاداریوں کی قدر کریں گے لیکن لندن آتے ہی برطانوی پولیس نے اسے گرفتار کیا اور اسے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا۔ اس نے اس ناروا سلوک پر امریکہ سے احتجاج کیا لیکن امریکی حکومت نے اسے جواب تک دینے کی زحمت نہ کی۔ برطانوی حکومت نے اسے ۲۰۰۰ء میں چلی کے حوالے کر دیا۔ اس کے خلاف مقدمہ چلا۔ ۳/دسمبر ۲۰۰۶ء کو اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دم توڑ گیا۔ اس کی موت پر پورے ملک میں خوشیاں منائی گئیں جب کہ امریکی حکومت نے ایک سطر کا تعزیتی پیغام تک جاری نہ کیا۔

انگولا کا باغی سردار ’’جوناس سیومنی‘‘ بھی امریکہ نواز لیڈر تھا۔ وہ برس ہا برس انگولا میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا۔ نومبر ۱۹۹۲ء میں امریکہ نے اسے کمیونسٹوں کے ساتھ امن معاہدے کا حکم دیا۔ اس نے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے نتیجے میں جوناس سیومنی بے دست و پا ہو گیا۔ معاہدے پر دستخطوں کے دو ماہ بعد کمیونسٹوں نے ’’ہامبو‘‘ میں اس کے ہیڈکوارٹر پر حملہ کر دیا۔ وہ فرار ہو گیا۔ آج اس واقعہ کو پندرہ سال گزر چکے ہیں، جوناس سیومنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہے لیکن امریکی حکومت اس کا ٹیلی فون تک نہیں سنتی۔

’’جنرل نوریگا‘‘ پانامہ میں امریکہ کا آلہ کار تھا۔ اسے بھی امریکیوں نے کمیونسٹوں کے خلاف استعمال کیا۔ وہ ۱۹۹۰ء تک امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا لیکن امریکہ کی تسلی نہ ہوئی۔ لہٰذا امریکہ نے پانامہ پر حملہ کر دیا۔ صدر نوریگا گرفتار ہوا۔ امریکی ایماء پر عدالت نے اسے ۴۰ سال قید با مشقت کی سزا سنا دی اور نوریگا گزشتہ چودہ برس سے جیل میں امریکی دوستی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

’’فرڈی ننڈ مارکوس‘‘ ۲۲ برس تک فلپائن میں امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا۔ اس نے فلپائن سے کمیونسٹوں

کو چن چن کر ختم کر دیا لیکن ۱۹۸۶ء میں امریکہ ہی نے اس کی حکومت ختم کرا دی۔ مارکوس امریکہ آ گیا۔ امریکہ نے اسے پناہ تو دے دی لیکن اسے وہ عزت اور وہ توقیر نہ دی جس کا وہ حق دار تھا۔ مارکوس نے باقی زندگی ہونولولو کے ایک چھوٹے سے مکان میں گزاری اور اسے ایک عام پناہ گزین کے برابر وظیفہ ملتا تھا۔ مارکوس ۱۹۹۹ء میں اسی بے بسی کے عالم میں آنجہانی ہو گیا۔

۱۹۷۹ء ہی میں امریکہ نے رہوڈیشیا میں بشپ ایبل منرور یوا کو موغابے اور نکومو کے مقابلے میں کھڑا کیا۔ بشپ امریکیوں کے لیے لڑتا رہا لیکن جب وہ لڑتے لڑتے کمزور ہو گیا تو امریکہ نے اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔

صدر صدام حسین کی کہانی تو پوری دنیا جانتی ہے۔ انقلابِ ایران کے بعد امریکہ نے صدام حسین کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ صدام حسین نے امریکہ کی ایماء پر ۲۲ر ستمبر ۱۹۸۰ء کو ایران پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ ۲۰ر اگست ۱۹۸۸ء تک ۸ سال جاری رہی اور اس میں دس لاکھ افراد ہلاک اور ۲۰ لاکھ زخمی ہوئے۔ صدام حسین ۱۹۹۰ء تک امریکہ کا دوست رہا لیکن پھر امریکہ نے تیل کے لالچ میں عراق پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں ۸۶ ہزار عراقی شہری شہید ہوئے۔ ۲۰۰۳ء میں امریکہ نے ایک بار پھر عراق پر حملہ کیا۔ صدام حسین گرفتار ہوا اور امریکی ہدایات پر اسے ۳۰ر دسمبر ۲۰۰۶ء کو بغداد میں پھانسی دے دی گئی۔

شاہ ایران سے لے کر صدام حسین تک امریکی تاریخ دوست کشی کی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ امریکی اپنی خارجہ پالیسی کو ’’ڈسپوزل ڈپلومیسی‘‘ کہتے ہیں۔ ان کا فلسفہ ہے ’’خریدو، استعمال کرو اور پھینک دو‘‘۔ امریکی قوم بلیڈ کند ہونے سے پہلے بیوی بدل لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے دوستوں کو کاغذ کے گلاس، پلیٹ، ٹشو اور گندی جراب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ لوگ ہمیشہ کیس ٹو کیس اور پراجیکٹ ٹو پراجیکٹ چلتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دوست جنرل اگستو پنوشے ہوں، جنرل رضا شاہ پہلوی ہوں یا جنرل صدام حسین یہ لوگ اس وقت تک انھیں دوست سمجھتے ہیں جب تک وہ ان کے لیے خدمات سرانجام دے سکتے ہیں اور جس دن انھیں محسوس ہوتا ہے یہ شخص ان کی ’’ذمہ داری‘‘ بنتا جا رہا ہے۔ یہ اس کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق جیسا سلوک کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ ان کی قبروں تک پر ’’سابق‘‘ کی مہر لگا دیتے ہیں۔ یہ ہے امریکی دوستی اور اس کا انجام اور امریکہ پچھلے دو سو برس سے ’’دوستی‘‘ کے اسی فلسفے پر کاربند ہے اور اس نے آج تک کسی شخص کے لیے اپنی یہ پالیسی نہیں بدلی لیکن ہمارے مہربان یہ سمجھ رہے ہیں ۲۰۰۷ء تک پہنچ کر امریکہ نے اپنا سارا فلسفہ بدل لیا ہے اور وہ اب بحیرۂ عرب کے آخری ساحل اور بحر اوقیانوس کی آخری لہر تک ہمارا ساتھ دے گا۔ ہمارے یہ دوست بھول گئے ہیں وہ امریکی جو اپنی ماں، اپنے باپ کو بھول جاتے ہیں وہ بحرانوں میں ان کا کیا ساتھ دیں گے۔ امریکہ ڈوبتے سورجوں کی زمین ہے اور ڈوبتے سورجوں کے بیٹے ہمیشہ چڑھتے سورجوں کے دوست ہوتے ہیں۔ امریکہ کی وفاداری کا رخ بدل رہا ہے۔ بس ایک دو ہفتوں کی بات ہے اور اس کے بعد نیا کپ، نئی پلیٹ اور نیا گلاس ہو گا اور کونڈا لیزا رائس ہو گی۔ (مطبوعہ: روزنامہ ’’ایکسپریس‘‘ ۹ر نومبر ۲۰۰۷ء)